ڈاکٹر زینت افشاں

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، وفاقی اردو یونی ورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد کیمپس

تانیثیت کی درست تفہیم اور منزل کا تعین: چند مسائل

Abstracts

Correct Comprehension & Determination of Right Destination of Feminism: Some of the Problems

By Dr. Zeenat Afshan, Assistant Professor, Department of Urdu, Federal Urdu University of Arts, Science & Technology, Islamabad Campus.

Feminism is a comparatively modern literary term. Sometimes there remains some sort of deficiency or misunderstanding somewhere in its comprehension. Being a new topic in Urdu particularly, it is suffering with the problems of vague and complications. In this article, it has been tried to understand its background and evolution in a brief way. It has also been tried to convey its comprehension by quoting examples from international literature and history. It has also been tried in the article to know what are the barriers and difficulties in the way of understanding feminism.

Keywords: Feminism, evolution, background, comprehension, international literature, history.

وہ کون سا زمانہ ہے جب عورت نے انسانی زندگی کے ارتقا اور معاشرے کو آگے بڑھانے کے لیے اپنا حصہ، اپنے ذمے واجب الادا حصّے سے زیادہ ادا نہیں کیا۔ کوئی وقت تھا جب عورت کا کردار، مرکزی گردانا جاتا تھا۔ کائنات کا آغاز ہوا تو عورت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی اور تمام زمانوں کو اس کا وجود تخلیقی سطح پر ثمرات سے

نواز تا رہا ہے اور یہ سلسلہ کائنات کے اخری انسان تک جاری و ساری رہے گا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے کسی ذی روح کو انکار نہیں ہو سکتا۔ خاندان کی بنیاد رکھنے کے لیے عورت کا وجود ناگزیر ہے۔ اس سے آگے چلیں تو خاندان کو جوڑ کر رکھنا اور انسانی بقا کو یقینی بنانے کے لیے عورت کائنات کا لازمی جزو ہے۔ جہاں عورت نسلِ انسانی کی بقا کے لیے جسمانی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہے وہاں اس کا تعلق ادب سے بھی اُتنا ہی قدیم ہے۔ شبنم شکیل لکھتی ہیں:

''عورت اور لفظ کا رشتہ معلوم تاریخ میں تقریباً ساڑھے تین ہزار برس سے قائم ہے۔ قدیم مصری تہذیب میں محفوظ شاعری کے نمونے سے لے کر آج تک عورت نے انفس و آفاق کے درمیان پھیلی ہوئی اس دنیا میں جو سوچا ہے، محسوس کیا ہے اور بیان کیا ہے، وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت اہم حصہ ہے۔ مظلومی اور محرومی کی منزلوں سے شعور و آگہی کا یہ سفر اپنے ساتھ جدوجہد کی ایک روشن تاریخ لیے ہوئے ہے۔''(۱)

تہذیب کے ارتقائی سفر میں یہ توازن بگڑا اور خواتین کا کردار ثانوی سے بھی کہیں بہت نیچے چلا گیا۔ یقیناً یہ صورتِ حال مختلف طرح کے دباؤ کے سبب پیدا ہوئی اور یونانی شاعرہ سیفو سے لے کر اب تک کا نسائی ادب اسی دباؤ کا شکار چلا آ رہا ہے۔ مذکورہ یونانی شاعرہ چاہے دسویں دیوی کہلاتی رہی مگر خواتین کے ادب پر دباؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ تضحیک اور حوصلہ شکنی بڑھتے بڑھتے زبان بندی تک پہنچ جاتی ہے۔ زبان بندی تک آتے آتے بھی زمانے گزرے اور پھر جبر اس قدر شدید اور ہمہ جہت تھا کہ عورت نے خود بھی یہ پابندیاں اختیار کر لیں۔ بغیر شناخت کے لکھا۔ اہتمام سے ایسا لکھا کہ جس سے یہ پتا نہ چلے کہ کسی عورت نے لکھا ہے۔ علامتیں، تشبیہیں، استعارے اور تمثالیں بھی پابندی کی زد میں رہیں کہ کہیں لکھاری کے عورت ہونے کی چغلی نہ کھائیں۔ یہاں یہ تفصیل، بیان کی محتاج ہر گز نہیں کہ مرد جو چاہے اور جیسا چاہے لکھے، اسے کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ اگر کوئی پوچھے تو اس کے طرف دار تو بیسیوں ہوں گے ہی، آخر آخر عدالتوں میں بیٹھے منصف بھی فیصلہ مرد تخلیق کار کے حق میں ہی دیتے رہے ہیں۔ اس کے برعکس عورت تخلیق کار نے اگر پابندیوں سے انحراف کی جرات کی تو ذاتی زندگی کی تلخیاں اُس کا پیچھا قبر تک کرتی رہی ہیں۔ عالمی ادب کی تاریخ کھنگالیں یا مقامی ادب کا ارتقا جانچیں، ادب اور ادیب کے بارے میں تنقیدی فیصلے سنانے والے افراد مرد ہی نظر آئیں گے، سو مابعد منظر نامہ بھی عورت کے خلاف نظر آئے گا۔ شبنم شکیل لکھتی ہیں:

''اسے اس حوالے سے Inspiration کا نام تو دیا مگر خود اس کے ہاتھ میں قلم ہونا مرد کے بنائے ہوئے معاشرے میں ممکن نہیں تھا۔ دنیا کی ہر تہذیب نے

عورت کی ذہنی صلاحیت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا۔ شاید اس کی انفرادی سوچ اور صلاحیت سے خوف کھا کر معاشرے نے رفتہ رفتہ اسے پس منظر کے دھندلکوں میں دھکیل دیا ۔۔۔ غالباً اسی لیے ورجینیا وولف سوال کرتی ہے کہ اگر شیکسپیئر کی بہن اُس جیسی صلاحیت کی مالک ہوتی تو معاشرہ اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا؟ ۔۔۔ وہ اشعار کا موضوع تو بن سکتی تھی مگر خود شاعر نہیں۔ داستان گوئی کا لامتناہی تانا بانا اس کے گرد بُنا تو جا سکتا تھا مگر وہ خود داستان گو یا کہانی کار بن سکتی، یہ ناممکن تھا۔ مرد کے بنائے ہوئے معاشرے میں یہ ایک سانحے سے کم نہ تھا۔"(۲)

عورت، معاشروں کے لیے عزت اور غیرت کی علامت رہی ہے لہٰذا کڑی نگرانی اور ایک مملوکہ شے کے طور پر اس کی حفاظت کی گئی۔ نظامِ اقدار ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی کسوٹی پر عورت کی ہر بات اور عمل کی پرکھ بہت شدت اور سختی سے کی جاتی ہے۔ اس رویے کا تعلق بھی تصورِ غیرت سے جوڑ کر یہ کسوٹی دو دھاری تلوار کر لی جاتی ہے۔ یوں عورت خود ساختہ پابندیوں کے نرغے میں تخلیقی سطح پر بے رحم گھٹن کا شکار ہو تی چلی جاتی ہے۔ اس بند گلی کے چاروں طرف کڑا پہرا ہے، جس کے باعث کسی بھی طرف فرار کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ انجام کار عورت کی تخلیقی صلاحیتوں کا مقدر یقینی موت کے علاوہ کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ زمانوں سے عورت کے ساتھ ہونے والا سلوک کم و بیش بہیمانہ رہا ہے۔ کشور ناہید نے اس کی تصویر کشی کچھ یوں کی ہے:

"ٹوائن بی کے بقول تمام ہیروز نے قتل، عورت کے باعث ہی کیے ہیں۔ جب بابر سمرقند میں تھا تو اس کے جانی دشمن شیبا خان نے اس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ بابر نے اس محاصرے کو توڑنے کا یہ حربہ استعمال کیا کہ اس نے اپنی بہن خانزادہ بیگم کو شیبا خان کے حوالے کیا اور فرار ہو گیا۔ یہ حوالہ دوسری جنگ عظیم میں جاپان اور جرمنی میں نسلوں کے بدلے کی داستان، ویت نام کی جنگ، فلپائن اور تھائی لینڈ میں طوائفیت کے فروغ، مشرقی پاکستان میں فوج کشی کے دوران ہزاروں لڑکیوں کی آبروریزی کے قصے اور افغانستا ن میں مقیم برطانوی اور امریکی فوج کے توسط سے کابل میں قحبہ خانوں کی موجودگی، ٹوائن بی کی کیا پُر لطف تصدیق کرتی ہے۔"(۳)

یہاں اس امر پر غور اور توجہ کی اشد ضرورت ہے کہ معاشروں کا بگاڑ کون کون سے اسباب کے نتیجے میں لازم ٹھہر تا ہے۔ اگر اس پہلو کی تفصیل بیان کرنا چاہیں تو بات طویل ہو جائے گی، اس لیے اختصار کے ساتھ صرف ایک اشارے اور سوال پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ اگر سماج کی نصف سے زیادہ آبادی کی تمام صلاحیتیں چھین کر اُسے ناکارہ کر دیا جائے تو ایسے معاشرے میں انسانی فلاح کی طرف جانے اور ارتقا کی توقع کیا عقل مندی ہو گی؟ اور آبادی بھی وہ جس پر انسانیت کی بقا کی تخلیق کا اہم ترین فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ جدید سائنس، ایجادات اور تحقیق نے ماں کے بچے پر پیدائش سے پہلے اثرات کے سلسلے میں جو حقائق انسان کے سامنے رکھے ہیں، وہ چشم کشا تو ہیں ہی فکر انگیز بھی ہیں۔ ایک صحت مند دماغ اور تخلیقی سطح پر آزاد فرد کی حیثیت سے عورت کائنات کو کیسا اعلیٰ اور مثالی مستقبل دے سکتی ہے، اس پر غور کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ اسی طرح بچے کی تعلیم و تربیت سے عورت کے تعلق اور جرمیات کی صورت حال کے بارے میں جدید تحقیق کے معاملات بھی ہمارے لیے برابر غور طلب ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ عورت شعوری طور پر اپنے حقوق سے آگاہ تو ہر زمانے میں رہی ہے مگر اس کا اظہار کم کم ہو تا رہا ہے۔ اب صورت حال ذرا مختلف ہے۔ اب دنیا بھر میں خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد مسلسل جاری ہے۔ تمام تر قدغنوں اور دباؤ کو رد کرتے ہوئے سیاسی اور تخلیقی سطح پر اظہار کھل کر ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی لکھتی ہیں:

> ''تانیثیت آج بہت تیزی سے اور بہت شدت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آ رہی ہے، جس میں بہت حد تک یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ خواتین ایک ایسا ادب تخلیق کریں جو ان کے جسمانی نہیں بلکہ روحانی دنیا تک پہنچتی ہو، جس میں ان کی خود اعتمادی، خود شناسی، اور خود نمائی موجود ہو، لہٰذا ان تمام آثار کو تقویت لگ بھگ اس وقت سے ملنی شروع ہو گئی جب بیسویں صدی کی دوسری دہائی کی ایک بے باک خاتون مصنفہ اور تانیثیت کی رہنما سیمون دی بوائر (Semon De Beauvior) کی تصنیف *The Second Sex* اور *The Life of Prime* منظر عام ہوئی۔''(۴)

انسانی زندگی کے ارتقا میں مرد اور عورت برابر کے حصّے دار ہیں۔ تخلیق کے جتنے بھی زاویے موجود ہیں، عورت کسی بھی طرح کم تر تو کیا، مرد سے دو قدم آگے ہی نظر آئے گی۔ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے عورت کا کردار یا اس کے حصّے کا کام برابری کی سطح سے کچھ نہ کچھ زاید ہی بنتا ہے۔ تاریخ کے ارتقائی سفر میں مرد اور عورت دو ناگزیر کردار روزِ اوّل سے ریل کی پٹڑی کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے متحارب ہونے کی گنجائش

کبھی بھی نہیں تھی کیوں کہ انسانی ارتقانے بہر طور جاری رہنا ہے اور اسے روکنے کی کسی بھی کوشش کے خلاف دونوں مل کر لڑتے ہیں۔ یہی وہ سبب ہے کہ جدوجہد کی رفتار کتنی بھی تیز کیوں نہ ہو، ایک دوسرے کو رد کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ یہاں تانیثیت کے حوالے سے دو ایک امور کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ بحث اپنے مطالب اور مقاصد کے حوالے سے بار بار مغالطوں اور غلط فہمیوں میں الجھتی یا الجھائی جاتی رہی ہے۔ تحریک کے وابستگان کے ہاں جذباتی ہیجان اور بعض اوقات ردّ عمل کے باعث غصّہ در آتا ہے، جس کی وجہ سے سیاسی، سماجی، ادبی اور فلسفیانہ موشگافیاں منفی تاثرات کے غلبے کی صورتِ حال پیدا کر دیتی ہیں۔ ایک آدھ پہلو کی وضاحت کے ضمن میں ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ لکھتے ہیں:

> ''تانیثیت محض ادبی متون ہی نہیں، پوری انسانی تاریخ اور جملہ ثقافتی مظاہر کے مطالعے کا نیا تناظر فراہم کرتی ہے۔ یہ نیا تناظر دراصل وہ نئے سوالات ہیں، جنھیں حقوقِ نسواں، آزادیِ نسواں کی تحریکوں اور تانیثی تھیوری نے گزشتہ صدی میں تشکیل دیا ہے۔ گویا تانیثیت محض ایک ادبی تھیوری نہیں ہے؛ اُس کی نہج اور دائرہ کار دونوں، عورتوں کی آزادی اور حقوق کی سیاسی و سماجی تحریکوں سے شدید طور پر متاثر ہیں۔ چناں چہ یہ سوال بھی اُٹھایا گیا ہے کہ تانیثیت کو ادبی تھیوری کے طور پر سمجھنا اور معرضِ بحث میں لانا صائب ہے؟ تانیثیت ادبی متون کی جمالیاتی قدر سے کچھ زیادہ سروکار نہیں رکھتی۔''(۵)

بعض سوال اور حقائق ایسے ہوتے ہیں جن سے آنکھیں چرانا انسانی زندگی کی صحت مندانہ بقا کے لیے کسی حادثے سے کم نہیں ہوتا۔ ان سوالوں اور حقائق میں سے ایک عورت کے حقوق کا معاملہ ہے۔ اس حوالے سے تاریخ کا جائزہ لیں تو طویل جدوجہد کے نشان ملتے ہیں۔ اس جدوجہد کا منفی اور تاریک پہلو یہ ہے کہ پسپائی کے نشانات بہت نمایاں، مسلسل اور بے شمار ہیں۔ اس ساری صورتِ حال میں جدید عہد فیمنزم کی اصطلاح سے روشناس ہوا اور اگر پیچھے نظر دوڑائی جائے تو ہمیں یہ ایک تحریک کی صورت میں نظر آتا ہے۔ فیمنزم کے بارے میں انیس ہارون لکھتی ہیں:

> ''پدرشاہی نظام مردوں کی معاشرتی بالادستی کو کہتے ہیں، جس کی بنیاد سماج، خاندان، سیاست، معیشت اور مذہب پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔ اس پورے نظام کی تاریخ ہے، جس کی جڑیں مختلف سماجوں، مروجہ رسوم وروایات اور مختلف

ادوار تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ۱۷ویں صدی کے زمینی حقائق کچھ اور تھے۔اس کے بعد آنے والی صدیوں کے مختلف اور ۲۱ویں صدی کے اپنے حالات ہیں، جس نے عورتوں کی جدوجہد کو مختلف سانچوں میں ڈھالا ہے۔

>"فیمنزم" دنیا کے مختلف ممالک میں اُن کے معاشرے، مزاج اور ضروریات کے مطابق شکل اختیار کرتا ہے۔ جس میں خود عورتوں کی اپنی تعلیم، شعور، کلاس اور ماحول کا دخل ہوتا ہے۔ عورتیں اپنی جدوجہد کے دوران "پدر شاہی" کو سمجھنے، اس سے نجات حاصل کرنے اور ایک غیر استحصالی معاشرہ قائم کرنے کے مراحل سے گزرتی ہے۔"[۶]

اگر نسائیت کی تحریک کو جدید عہد میں ہی جانچنا چاہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مراعات یافتہ طبقوں نے عورتوں کی بیداری کی لہر کو دبانے کے لیے اصلاحی نقطہ نظر سے کچھ اقدامات ضروری خیال کیے۔ ان طبقات میں ممکن ہے کہ کچھ لوگ اخلاص بھی رکھتے ہوں مگر اس کوشش کو عورتوں کو ان کے حقوق دینے کی رائج تحریک کسی طور بھی نہیں کہا جاسکتا البتہ اس عمل سے عورت کی بیداری کی رفتار ضرور سست ہوئی۔ اس تحریک نے برصغیر میں بھی نمود کیا اور اور ولیم کیری کے بین بین رابندر ناتھ ٹیگور اور سر سید احمد خاں کا نام لینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔

انیسویں صدی کے آخر آخر یا بیسویں صدی کے اول اول اصلاحی تحریک نے ایک اور روپ اختیار کیا، جسے مغربی افکار کے تحت لبرل یا روشن خیال نسائیت کہا جاسکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریریں اس ذیل میں ضرور شمار ہوں گی مگر عملاً اس تحریک کا مقصد عورت کو اس کے حقوق دلوانے کے لیے کسی انقلابی اقدام کی حمایت بالکل نہیں رہا۔ اس تحریک نے عورت کو مرد کے شانہ بشانہ تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب ضرور دی، اس سلسلے میں قائد اعظم کے تصورات بھی بہت نمایاں اور واضح ہیں۔ حیرت انگیز طور پر یہ حقائق سامنے لانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ بعض مصلحین کو بھی عورتوں کو ان کے حقوق نہ دینے یا نہ دلوانے کے سلسلے میں موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جسے اصل مسئلے کی تفہیم کے راستے کی بہت بڑی دیوار سمجھا جارہا ہے۔ ملاحظہ کیجیے، ڈاکٹر حمیرا اشفاق لکھتی ہیں:

>"سر سید احمد خان، محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد اور شرر اور ان کے دیگر کئی ساتھی اپنے تئیں کوشاں تھے لیکن ان جیسے روشن خیال افراد

بھی خواتین کی تعلیم میں جدید تعلیم کے مخالف رہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی عورت کو، ایک مخصوص فریم میں دیکھا گیا اور ایک محدود زندگی میں رکھا گیا۔ ایک ایسی قید جہاں قلم، فکر اور تعلیم و تربیت کی گنجائش بہت کم رہتی تھی۔۔۔ خواتین کی تعلیم کے فروغ میں ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ کمزور رہی ہے۔" (۷)

تیسری سطح پر یہ تحریک، ترقی پسند نسائیت کہلاتی ہے مگر ترقی پسندوں کے ہاں طبقاتی امتیازات ختم کرنا اوّلین مقصد رہا ہے اور عورتوں کی آزادی سے اُن کا موضوعاتی طور پر کچھ لینا دینا نہیں یا کم از کم اُن کی ترجیح نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب طبقاتی معاشرہ ختم ہو گا تو عورت از خود تمام حقوق حاصل کر لے گی، حالاں کہ یہ توقع کسی حد تک غلط تھی اور تاریخ نے ثابت کیا کہ یہ سوچ کسی طور درست نہ تھی۔

عورت کے حقوق کے حصول کے لیے نسائیت کی تحریک کا آخری حصہ، جو آج کل کسی نہ کسی حد تک روبہ عمل ہے، اُسے انقلابی کہا جا سکتا ہے۔ اس تحریک میں عورت کے مکمل حقوق کے حصول کے لیے کسی نہ کسی حد تک ٹکراؤ کی حکمتِ عملی رائج ہو رہی ہے اور پدر سری خاندانی نظام کے خلاف اعلانِ جنگ کی سی صورت حالات ہے۔ اس سلسلے میں اردو ادب کے قارئین کے لیے عصمت چغتائی کا مطالعہ اصل صورتِ حال سمجھنے کے لیے کسی حد تک مفید ہو سکتا ہے۔

عالمی ادب میں عورت کے حقوق کی جدوجہد کے نشانات بہت واضح اور گہرے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں یہ تحریکیں سست رو ہیں۔ ان میں شدت اُس درجے کی نہیں، جتنی ہونی چاہیے۔ ساتویں صدی عیسوی کی جلاوطن ہونے والی شاعرہ سیفو کا حوالہ تو ادبی سطح پر زیادہ تر لوگوں کے ذہنوں میں نقش ہے مگر رابعہ بصری کی زندگی اور جدوجہد عام طور پر ادب کے طالب علموں کا موضوع کبھی بھی نہیں رہی۔ اُن کی متصوفانہ زندگی اور اقوال ایک بہت ہی مفصل مضمون اور مطالعے کا موضوع ہے۔

رابعہ بصری کا حوالہ اس لیے اور بھی اہم ہے کہ اس نے قطعی طور پر مردوں کے لیے مخصوص شعبے یعنی تصوف کو اپنا میدان بنایا اور پوری دلیری کے ساتھ نباہ کیا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی مگر اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ اگر اس موضوع پر توجہ دی جائے تو عورتوں کی جدوجہد کے کچھ نئے زاویے اور پہلو سامنے آنے کے امکانات موجود ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ کوئی طبقہ یا معاشرہ خیر ا ور خیر کے حامیوں سے خالی نہیں ہوتا۔ اس پہلو کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں ان واجب الاحترام افراد اور گروہوں کو نظر

انداز نہیں کرنا چاہیے تاکہ مسئلے کی درست تفہیم اور اس کا حل تلاش کرنے میں غلطی کا امکان کم سے کم رہے۔ فہمیدہ ریاض نے لکھا ہے:

> ''لیکن یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ہر دور میں غالب طبقات اور نسلوں میں ایسے جمیل اور روشن دل و دماغ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں جو اعلیٰ وجدان کی بدولت رنگ، نسل، طبقے بلکہ اپنے دور سے ہی بالاتر ہو کر سوچ سکتے تھے۔''(۸)

ادھر ایکو فیمنزم کی اصطلاح یا تصور کے داعی بھی اپنے تئیں ایک الگ تحریک کے دعویدار ہیں۔ اس کا اردو روپ ماحولیاتی مادریت ہو یا کوئی چوتھا ترجمہ بھی کر لیا جائے مگر اس کی منزل وہی عورت کے اصل مقام و مرتبے کا حصول ہے۔ نسترن احسن فتیحی کا کہنا ہے:

> ''ایکو فیمنزم اس استحصالی رویّے کے خلاف احتجاج کی ایسی آواز ہے جو استحصال سے روکتی ہے اگر لوگوں نے اس پر کان دھرے تو پھر ایک ایسی دنیا وجود میں آئے گی جو استحصال سے پاک ہو گی، جہاں تمام طبقے مسابقت کی بجائے باہمی تعاون، بھائی چارے اور ایثار و قربانی کے ذریعے لین دین کرتے دکھائی دیں گے۔''(۹)

عورتوں نے تاریخ کی اس طویل ترین تحریک کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ اگر صرف اور صرف ادب کا حوالہ بنیاد بنالیں تو ایران کی قرۃ العین طاہرہ کو کون بھول سکتا ہے۔ صرف چھتیس (۳۶) سال کی عمر میں حکومتِ وقت نے سزائے موت دے دی۔ قرۃ العین طاہرہ مزاحمتی تحریکوں کے لیے ہمیشہ قابل توجہ رہی ہیں اور خاص طور پر خواتین کے لیے مثالیے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ورجینیا وولف، ماریا سینووا، سلویا پلیتھ، این سیکسٹن اور ادھر پاکستان کی سارا شگفتہ نے مختلف طریقوں سے خودکشی کی۔ یقیناً معاشروں کا دباؤ ایسا شدید تھا کہ شاید زندہ رہنا ممکن نہیں رہا۔ ایسی خواتین تخلیق کاروں کی فہرست شاید کسی شمار میں نہیں آسکتی جن کی ذاتی زندگی مذکورہ تحریک سے وابستگی کے سبب اجیرن کر دی گئی اور وہ بھی موت سے کم بڑی سزا نہیں۔ اُن خواتین کی فہرست کون تیار کرے، جنھوں نے یہ جبر از خود اپنے اوپر خود ساختہ پابندیوں کی صورت میں نافذ کیا اور تخلیقی وفور سے رابطہ منقطع کر لیا۔

ہسپانوی نژاد امریکی ادیبہ مارجری اگیوسین کا معاملہ تو بے حد عجیب و غریب اور ایک طرح کی ستم ظریفی ہے کہ وہ ہسپانوی زبان میں لکھتی ہیں اور نسائی رجحانات کے سبب بُری طرح نظر انداز ہوئیں۔ بعد ازاں مارجری نے

مردانہ نام ونسٹ فان گاگ کے نام سے کتاب لکھی جسے "لبرودی اورو" کے نام سے ایک بیش بہا اعزاز دیا گیا۔ ایسی خواتین تخلیق کاروں کی فہرست بھی کم طویل نہیں، جنھیں اپنے ملک اور قوم نے تو پذیرائی سے محروم رکھا مگر عالمی سطح کے اعزازات دیے جاتے رہے۔

نسائی شعور یا نسائیت کی تحریک کے خلاف تعصبات کا عالم یہ ہے کہ رد عمل کے طور پر ایک طویل عرصے سے خواتین کے الگ اشاعتی اداروں کے قیام کا سلسلہ بھی مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خواتین کی لکھتوں کے تراجم اور ان کی اشاعت کے معاملات شدید تعصب کے باعث بُری طرح متاثر ہوتے چلے آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے اداروں کے قیام سے کسی حد تک اشک شوئی ہو سکتی ہو۔ ظاہر ہے کہ تحریک کے اثرات کثیر جہتی ہیں لہٰذا انسانی زندگی کے تمام پہلو متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر نزہت عباسی لکھتی ہیں:

> "عالمی نسائی ادبی تحریک کے پس منظر میں دیکھا جائے تو عورتوں کی براہِ راست
> شمولیت نے ادب کو گراں مایہ خیالات، موضوعات اور خاص طور پر زبان و بیان
> اور لب و لہجہ کی نئی جہتوں اور رفعتوں سے روشناس کیا۔"(۱۰)

فیمنزم یا نسائیت کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے عمومی طور پر مذاہب کا حوالہ یا تو یک سر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر اس کے خلاف اظہارِ خیال کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے مگر یہ روّیہ درست نہیں۔ ہمیں مذاہب کی اصل تعلیمات اور بعد ازاں قطع و برید اور تبدیلیوں کو پیشِ نظر رکھ کر درست نتیجے تک پہنچنے میں زیادہ تردد کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر قاضی عابد کی رائے نظر انداز نہیں کی جا سکتی، ملاحظہ کیجیے:

> "حقیقت یہ ہے کہ اپنی ابتدائی اور خالص شکل میں دنیا کے مختلف مذاہب نے
> عورتوں کی آزادی اور حقوق کی بات ضرور کی مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ
> ساتھ روایتی انداز، قبائلی صورتوں کی شکل اختیار کرتا گیا اور انقلابی عمل کی بجائے
> روایت پرستی میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔"(۱۱)

یہ یا اس نوعیت کی کسی بھی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس میں پنہاں صداقت سے مفر ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں مذاہب کی تعلیمات اور تاریخ کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے۔ اس نوعیت کے مباحث میں توازن قائم رکھنا بے حد مشکل کام ہے اور زیرِ بحث موضوع جس طرح سے تیزی کے ساتھ توجہ حاصل کر رہا ہے، اُسی قدر مغالطے، غلط فہمیاں اور کج فہمیاں بھی راہ پا رہی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ افراط و تفریط اور جذباتیت سے دامن بچا کر اصل مقصد کی جانب پیش قدمی جاری رکھی جائے۔

حواشی

۱۔ شبنم شکیل، خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی ، (اسلام آباد: وزارتِ ترقی خواتین، حکومت پاکستان،۲۰۰۵ء)، ص۔۳۱

۲۔ ایضاً، ص۔۸۔۹

۳۔ کشور ناہید،ادب اور نسائیت، مشمولہ خاموشی کی آواز، مرتبہ ڈاکٹر فاطمہ حسن، آصف فرخی، (کراچی: انجمن ترقی اردو: ۲۰۱۸ء)، ص۲۲۔۳۲

۴۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی، دیباچہ مشمولہ قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں تانیثی شعور، مصنّف نعمان نذیر، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۱ء)، ص۳۱

۵۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، متن، سیاق اور تناظر، (اسلام آباد: پورب اکادمی: ۲۰۲۱ء)، ص۸۸

۶۔ انیس ہارون، فیمنزم اور پاکستانی عورت، مشمولہ فیمنزم اور ہم: ادب کی گواہی، مرتبہ ڈاکٹر فاطمہ حسن، (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۱۔۳۱، اشاعت دوم

۷۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق، مجلّہ"عصمت" کا شعورِ نسواں میں کردار اور ادبی خدمات مشمولہ عصمت: نوآبادیاتی ہندوستان میں خواتین کی مجلّاتی صحافت ، مرتبہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق ، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص۷۱

۸۔ فہمیدہ ریاض، ردِّ تشکیل آخر کیوں؟ مشمولہ ادب کی نسائی ردِّ تشکیل، (کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۶ء)، ص۸

۹۔ نسترن احسن فتیحی، ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۹

۱۰۔ ڈاکٹر نزہت عباسی، اردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب و لہجہ : تحقیقی و تنقیدی جائزہ، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۳ء)، ص۲۱

۱۱۔ ڈاکٹر قاضی عابد، اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر، (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۶ء)، ص۲۱۰

مآخذ

۱۔ اشفاق، حمیرا، ڈاکٹر، مجلّہ عصمت کا شعورِ نسواں میں کردار اور ادبی خدمات مشمولہ عصمت: نوآبادیاتی ہندوستان میں خواتین کی مجلّاتی صحافت، مرتبہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء

۲۔ ریاض، فہمیدہ، ردِّ تشکیل آخر کیوں؟ مشمولہ ادب کی نسائی ردِّ تشکیل، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۶ء

۳۔ شکیل، شبنم، خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی ، اسلام آباد: وزارتِ ترقی خواتین، حکومت پاکستان، ۲۰۰۵ء

۴۔ صدیقی، صالحہ، ڈاکٹر، دیباچہ مشمولہ قرۃالعین حیدر کے ناولوں میں تانیثی شعور ، مصنّف نعمان نذیر، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۱ء

۵۔ عابد، قاضی، ڈاکٹر، اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۶ء
۶۔ عباسی، نزہت، ڈاکٹر، اردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب و لہجہ: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۳ء
۷۔ عباس، نیّر، ڈاکٹر، متن، سیاق اور تناظر، اسلام آباد: پورب اکادمی: ۲۰۲۱ء
۸۔ قتیجی، نسترن احسن، ایکو فیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ، لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء
۹۔ ناہید، کشور، ادب اور نسائیت، مشمولہ خاموشی کی آواز، مرتبہ ڈاکٹر فاطمہ حسن، آصف فرخی، کراچی: انجمن ترقی اردو: ۲۰۱۸ء
۱۰۔ ہارون، انیس، فیمنزم اور پاکستانی عورت، مشمولہ فیمنزم اور ہم: ادب کی گواہی، مرتبہ ڈاکٹر فاطمہ حسن، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۱۳ء، اشاعت دوم